

یادِ ورگہ کی دنیا

ایک تنقیدی مطالعہ

محمد احمد غازی

یوپی کے قصبات فرخ آباد اور ان کے نواح میں بنگش اور دوہیلہ پٹانوں کی ایک کثیر تعداد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے آباد چلی آرہی ہے۔ مغلیہ حکومت کے دورِ زوال میں ان اصحاب نے برصغیر کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نسلاً افغان اور مسلماً کما حقہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ ہمیشہ برصغیر میں ہر اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں جس کا مقصد برصغیر میں اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کا احیاء ہو۔ شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید بریلوی وغیرہ اکابر کو اسی علاقہ سے معاہدین حاصل ہوئے۔

انہی پٹانوں میں کوٹاٹ کے ایک بزرگ حسین علی خان تھے جو مدہ آخون یعنی استاد اکبر کے نام سے معروف تھے۔ حسین علی خان ۱۷۱۵ء کے قریب قائم گنج آکر آباد ہوئے جو ان کی آمد سے دو ایک سال قبل ہی نواب محمد خان بنگش نے اپنے لڑکے قائم خان کے نام پر قائم کیا تھا۔ آخون صاحب کی اولاد نے آگے چل کر بنگشوں اور دوہیلوں کی قدیم روایت کو زندہ کیا۔ ان کے پڑپوتے مولوی فدا حسین خان کے زمانہ سے اس خاندان نے انگریزی علوم میں نام پیدا کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد دکن میں وکالت کا آغاز کیا اور بہت جلد حیدر آباد اور پھر سارے ہندوستان میں بطور قانون دان ان کی شہرت پھیل گئی۔ آئین دکن کے نام سے اردو زبان میں پہلا قانونی رسالہ انہوں نے جاری کیا۔ قانون کے مختلف موضوعات پر انہوں نے بیسی سے زائد کتابیں لکھیں۔ یہی مولوی نذاحسین خان تھے جن کے تین صاحبزادے دنیا نے علم و سیاست کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو علمی اور سیاسی مناصب کو طے کرتے ہوئے آخر میں مہارت

کے صدر بن کر شہرت و مقبولیت کی آخری بندیوں پر پہنچے۔ ان کے منجملے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خان بطور ایک ادیب، بالغ نظر نقاد، صاحب بصیرت مفکر و مورخ کی حیثیت سے ہندوستان و پاکستان کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف ہوئے۔

زیر نظر کتاب یادوں کی دنیا (انظم گڑھ، ۱۹۶۷ء) ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ان کی زندگی کی کم و بیش ساٹھ سال کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ یہ مشاہدات نہ صرف ترمذی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کی تعلیم، مغربی تہذیب و تمدن، فرانس کا نظام تعلیم، اردو ہندی تنازعہ اور اسی جیسے کئی دوسرے اہم مسائل تفصیل سے زیر بحث آگئے ہیں، ابتدائی دو ابواب میں مصنف کے خاندان کے بارے میں بڑی دلچسپ اور تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ بنگش خاؤادہ نوابان کے مورث اعلیٰ ازاب محمد خان بنگش کی شخصیت و کردار کا بھی اچھا ذکر آ گیا ہے (ص ۱۲-۱۶) تیسرے باب میں مصنف نے اپنے سات بھائیوں کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ افسوس کہ ان سات بھائیوں میں سے چار نو جوانی ہی میں انتقال کر گئے، اپنے ایک جوان مرگ بھائی عابد حسین خان کے بارے میں مصنف نے خلیفہ عبدالمکیم صاحب کی رائے نقل کی ہے۔ خلیفہ صاحب جو ان کے ہم جامعیت روچکے تھے کہا کرتے تھے کہ میں نے ایسے ذہین لوگ اپنی زندگی میں کم دیکھے ہیں (ص ۲۹-۳۰)۔

یورپی اور بیمار کی قدیم ہندی۔ اسلامی تہذیب جس کو اکثر و بیشتر تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کے نمونے اور جھلکیاں بھی جستہ جستہ کتاب میں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ (ص ۵۶-۵۷) انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کی والدہ محترمہ حملہ کی بعض غریب خواتین کی خفیہ خفیہ مدد کیا کرتی تھیں، انہوں نے اپنی اولاد کی ناسلامانہ اور اعلیٰ تربیت کس طرح کی۔

کتاب کا چوتھا باب، فخر خاندان، ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر مشتمل ہے۔ مصنف نے باب کا عنوان فخر خاندان رکھ کر زیادہ قواضع سے کام لیا ہے، واقعہ ہے یہ کہ ذاکر حسین اپنے علم، اپنے علوم اور اپنے کردار کی وجہ سے سیاسی اختلافات کے باوجود، فخر ہندوستان تھے۔ یہ پورا باب بیش بہا معلومات اور قیمتی نکات سے بھرپور ہے جامعہ ملیہ کا قیام، شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا خطبہ صدارت، مولانا محمد علی جوہر کا غلوس اور وارننگل، طلبہ جامعہ کاردینی ذوق اور جذبہ حکیم

اجمل خان کی خدمات اور اس طرح کے کئی اور موضوعات سے اس باب میں بحث کی گئی ہے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے قیام کے دوران وہ کسی طرح وصال کے ارباب علم و فکر سے متاثر ہوئے اس کا بھی اچھا تذکرہ جامعہ کو چلانے میں موصوف نے جو خدمات انجام دیں ان کی بھی تفصیل اس میں آگئی ہے اس باب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں بنیادی تعلیم، فلسفہ تعلیم اور مقاصد تعلیم پر ذاکر صاحب کے خیالات سے بحث کی گئی ہے۔ ذاکر صاحب کانگریس کی مقرر کردہ بنیادی تعلیم کی کمیٹی کے صدر تھے۔ اگرچہ ان کے تعلیمی نظریات سے کلی اتفاق کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب تک ان کے تعلیمی نظریات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا یا کم از کم پیش نہیں کیا گیا، ڈاکٹر یوسف حسین خان نے بڑا اچھا کیا کہ ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات پر تفصیلی بحث کی اور ان کی اپنی تحریروں اور تقریروں کے طویل اقتباسات دیکر قاری کے لئے ایک مربوط اور جامع تصویر پیش کر دیا ہے جن سے کئی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ علم و فضل کے اس قدر بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود دین و مذہب اور قومیت سے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین کے خیالات میں بعض جگہ بے ربطی بلکہ تضاد سامعوس ہوتا ہے، (مثلاً ص ۱۱۱، ۱۱۲ وغیرہ پر ہندی قومیت اور اسلام کے تعلق پر بحث) ڈاکٹر ذاکر حسین نے گورنر بہار اور نائب صدر ہند کی حیثیتوں میں جس اعلیٰ کردار، بلند اخلاق اور تواضع کا مظاہرہ کیا اس پر بھی آگے چل کر مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ ملیہ نے مولانا محمد علی جوہر اور عظیم اجمل خان جیسے اکابر و فاضل کی سرپرستی اور رہنمائی میں جو لوگ تیار کئے تھے انہوں نے کسی طرح اپنے اساتذہ کی ترغیبات کو پورا کیا پھر خود جامعہ ملیہ کی انہوں نے جس انداز اور لگن سے خدمت کی اس سے ان کی نیک نفسی اور علوم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جامعہ سے وہ بائیس سال وابستہ رہے اور ہر طرح کے مالی اور سیاسی نشیب و فراز کے باوجود انہوں نے جامعہ سے تعلقی توڑنا گوارا نہ کیا، اس دوران ان کو عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بھی پیش کی گئی (ص ۱۵۱)، لیکن انہوں نے اس کو قبول نہ کیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین نے خود بھی جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ تقریباً پانچ سال جامعہ میں رہے (ص ۱۹۵)۔ اس دوران انہوں نے جامعہ میں کیا دیکھا، کس کو کیا پایا، کیا پڑھا اور کیا سیکھا، یہ

سب تفصیل کتاب کے پانچویں باب ”جامعہ کی زندگی میں دی گئی ہے اس باب کا سب سے دلچسپ اور معلومات افزا حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے جامعہ کے اساتذہ کا تعارف کرایا ہے۔ خاص طور پر مولانا محمد سورتی اور مولانا اسلم جیلر جہوری کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن شاید اپنے اساتذہ میں وہ سب سے زیادہ متاثر تاریخ اور سیاسیات کے پروفیسر کیلاٹ صاحب سے ہوئے جن کا ذکر انہوں نے آٹھ دس صفحات میں کیا ہے۔ اس باب میں جامعہ ملیہ کے نصاب تعلیم، وہاں کے طریقہ تدریس اور کانگریس کی تحریکات میں طلبہ جامعہ کی شرکت پر بھی خاصی معلومات ملتی ہیں۔ اس باب میں اقبال سے ملاقات کے زیر عنوان مصنف نے علامہ اقبال سے اپنے دلی تعلق اور اس کے آغاز کا بھی ذکر کیا ہے، جب وہ جامعہ میں داخل ہوئے تو ان کو بانگ درا پوری حفظ تھی (ص ۱۹۳) دوسری فارسی تصانیف کے بھی کافی حصے ان کو یاد تھے۔ ان کا مدران کے پھرتے بھائی محمود حسین خان مرحوم کو اقبال سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ان دونوں نے خاص طور پر اقبال سے ملاقات کے لئے لاہور کا سفر کیا اور زیارت اقبال سے شاد کام ہوئے۔ اس ملاقات میں اقبال بار بار مولانا محمد علی کا ذکر کرتے رہے، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا محمد علی کی خواہش تھی کہ اقبال جامعہ کی صدارت قبول کر لیں لیکن وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے معذور رہے (ص ۱۹۴) اقبال سے ان کی دوسری ملاقات ۱۹۳۷ء میں دوبارہ ہوئی، اس موقع پر ان کی مفکر اسلام سے تفصیلی ملاقات رہی، اب ان میں اس قدر پختگی آگئی تھی کہ وہ اقبال سے استفادہ کر سکیں (ص ۱۹۴) اس ملاقات میں ڈاکٹر یوسف حسین نے محسوس کیا کہ اقبال ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بے حد متفکر ہیں، وہ کہتے تھے کہ جب ایک مسلمانوں کی علیحدہ مملکت نہ ہوگی ان کا دین و تمدن خطرہ میں رہے گا (ص ۱۹۴-۱۹۵) ان ملاقاتوں سے یوسف حسین خان کو اقبال سے جو عقیدت تھی اس میں اضافہ ہو گیا (ص ۱۹۵)۔

اس باب میں مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے جامعہ کے کتب خانہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا وہ نسخہ بھی دیکھا جو مولانا محمد علی جوہر کے تصرف میں رہ چکا تھا۔ اس پر مولانا کے قلم سے طویل حواشی بھی تھیں، خاص طور پر جہاں کسی مقالہ نگار نے اسلام کے خلاف کوئی بات لکھی تھی وہاں مولانا کے قلم میں بڑی روانی اور جوش محسوس ہوتا تھا (ص ۱۹۶) یوسف حسین خان نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان حواشی و تاثرات کو اگر کوئی علیحدہ کر کے شائع کر دے تو ایک اچھی خاصی

کتاب نکل آئے گی۔

چٹا باب دیارِ فرنگ مصنف کے قیامِ فرانس اور وہاں ان کی تعلیم کے تاثرات و جذبات پر مشتمل ہے۔ فرانس کی خواتین، فرانسیسیوں کے تہوار، فرانسیسی خاندان، سوربون یونیورسٹی، سوربون اور فرانس میں ارتقائے تعلیم کی تاریخ، پیرس شہر، پیرس کے اہل علم، فرانسیسی تہذیب، فرانسیسی ادب اور اس جیسے بہت سے اہم اور دلچسپ موضوعات پر مصنف نے ایک ادیب اور نقاد کی حیثیت سے گفتگو کی ہے۔ ان کو اٹلی، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ پیرس میں قیام کے دوران ان کو ہندوستان کے متعدد اصحاب کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں مرقی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، سجاد ظہیر وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۲۸ء میں اپنے سفرِ یورپ کے دوران یوسف حسین ہی کے پاس پیرس میں قیام کیا۔ اس قیام کا ذکر خود مولانا نے اپنے سفرنامے میں (جورد اصل خطوط کا مجموعہ ہے) کیا ہے۔ مولانا کے قیامِ پیرس کی خاصی تفصیل اس باب میں دی گئی ہے۔ مولانا کی بذلہ سنجی، اطرافت اور طنز و مزاح کے بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دینداری اور خلوص کے لئے اتھک بار چہروں اور خشک اور بے رونق سورتوں کا ہونا ضروری نہیں ہے، مولانا کے ہاں بیک وقت یہ دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے عام تاثر پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ایک بہت پتے کی بات جس سے ان کی بالغ نظری کا خوب اندازہ ہوتا ہے، یہ کہی ہے کہ مشرقی ممالک میں پارلیمانی نظام حکومت اس شکل و صورت میں قائم نہیں رہ سکے گا جو انگلستان میں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم تاریخی عمل کو یک بیک طور میں نہیں لاسکتی، اس میں قومی احوال کے لحاظ سے تصرف پذیری لازمی ہے۔ تاریخ کی اسی دھوپ چھاؤں میں قومیں اپنی تقدیر بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ (ص ۳۰۶)

۱۹۳۰ء میں یوسف حسین فرانس سے واپس ہوئے، ہندوستان میں ان کو حیدرآباد میں مستقل قیام کرنے اور وہاں اپنی باقاعدہ علمی زندگی کے آغاز کرنے کا موقع ملا۔ ساتویں باب میں انہوں نے قیامِ حیدرآباد کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں مرحوم حیدرآباد کی علمی زندگی، سرکاری نظام کی علمی و ادبی سرپرستی و حوصلہ افزائی کے علاوہ حیدرآباد کی لاڈ وال یادگار جامعہ عثمانیہ اور وہاں کے ارباب علم و دانش کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے سلیقہ شاعر انقلاب جو شش طبع آبادی کا بھی ذکر ہے۔

جوش اس زمانہ میں وہاں ناظر ادبی تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ ترجموں پر ادبی لحاظ سے ایک نظر ڈالیں
 ان کے اصلاح کردہ اور نظر ثانی شدہ بعض ترجمے مزید فنی نظر ثانی کے لئے یوسف حسین کو دیئے گئے
 تو پتہ چلا کہ جوش صاحب نے ان پر محض اچھٹی ہوئی نظر ڈالی تھی۔ بعض جگہ چالیس پچاس صفحوں تک
 سوائے ایک آدھ نشان کے کچھ نہ تھا (ص ۲۱۳)۔ دوسرے اصحاب علم کو بھی جوش صاحب یہ شکایت
 تھی کہ وہ محنت سے اپنا فرض ادا نہیں کرتے (ص ۳۱۲)۔

جوش صاحب کے سلسلہ میں دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اقبال کو بڑا شاعر
 ماننے سے انکار کرتے تھے اور میں (یوسف حسین) اسے اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔
 میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کو غالباً یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ اقبال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں
 یہ حق تو ان کا ہے۔ میں اسے ان کی سادہ لوحی پر محمول کرتا ہوں (ص ۳۱۲)

عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلق سے اس باب میں سب سے زیادہ تفصیلی تذکرہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق
 کا ہے جن کو یوسف حسین عثمانیہ یونیورسٹی کا اصل مئجسٹریٹ قرار دیتے ہیں (ص ۳۱۴) اُردو زبان کے
 فروغ کے سلسلہ میں مولوی صاحب نے پچاس برس تک جو خدمات انجام دیں ان کا خاص تذکرہ بلکہ
 جملہ اس باب میں ملتی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق شیعہ حضرات کے بارے میں خاصے متشدد خیالات رکھتے
 تھے۔ محمود احمد عباسی نے بھی اس مفروضہ کو خوب آگے بڑھایا۔ لیکن یوسف حسین نے اپنے طویل
 ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اس خیال کی تردید کی ہے (ص ۲۷۶-۳۲۸)۔ جوش بلگرامی صاحب نے
 اس بارے میں عبدالحق کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، یوسف حسین نے اس کی تردید کی ہے۔

یہ کیونکر ممکن تھا کہ یوسف حسین سا ادیب و نقاد اور نکتہ رسی برسوں حیدرآباد میں رہے اور ایلہ را
 اور اجمنہ کے شہرہ آفاق آرٹ اور تصاویر کو نہ دیکھے۔ انہوں نے بارہا آرٹ کے یہ نادر اور
 تاریخی نمونے دیکھے کتاب کے کئی صفحات میں انہوں نے ان تصاویر کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان میں
 سے اکثر تصاویر برہنگی اور عریانی کا شاہکار ہیں، جبکہ ان کو بنانے والے فنکار وہ بدھ مجسٹروں
 جو لذتِ نفس سے جان چھڑانے کے لئے ترک دنیا کر چکے تھے اس تضاد کی وجہ یوسف حسین کے
 الفاظ میں یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں اور جب کہیں رہبانیت اختیار کی گئی تو اس کا یہی

رد عمل ہوا..... نسوانی غمرہ واداک کی کوئی صورت ایسی نہیں جو ان تصویروں میں موجود نہ ہو۔ جنسی لذت اندوزی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے فن کاروں نے نمایاں نہ کیا ہو۔ یہ اُس تعلیم کا رد عمل تھا جو تخر و اور رہبانیت سکھاتی تھی۔ اس طرح وہ مذہبی فلسفہ جو زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے زندگی اس کے ماننے والوں سے انتقام لیتی ہے۔ (ص ۳۳۴-۳۳۵)

حیدر آباد کی دوسری ادبی اور علمی شخصیات میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، آغا حیدر حسن، مسٹر چوٹی ٹائیڈو، شاہزادی درشا ہوار، سر اکبر حیدری، ان کی بیگم، نواب سالار جنگ، مہدی نواز جنگ اور کئی دوسرے اصحاب کا اچھا اور دلچسپ تعارف کرایا گیا ہے۔ آخر میں حیدر آباد کی آخری دور کی تاریخ اور سقوط حیدر آباد کے المناک واقعات کا بھی ذکر ہے۔ حیدر آباد کے واقعات غلطے ملوث افزائیں۔ انجمن اتحاد المسلمین کے آخری اور دیوالی شہرت کے مالک صدر تاسم رضوی مرحوم کے کردار کے بارے میں خاصی متضاد باتیں کہی جاتی رہیں یوسف حسین کو ان تمام واقعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر المیہ حیدر آباد کی ذمہ داری دلوں کے نا تجربہ کار سیاستدانوں پر ڈالی ہے جن میں وزیر اعظم میر لائق علی اور سید تاسم رضوی مرحوم وغیرہ بھی شامل ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے جو علی سیاست کا وسیع تجربہ رکھتے تھے قطعی طور پر کہا تھا کہ حیدر آباد کو ایک سال کے لئے معاہدہ (انتظام جاریہ) کو قبول کر لینا چاہیے (ص ۳۹۲) لیکن میر لائق علی نے اس مشورہ کو نہ مانا۔ دوسری طرف تاسم رضوی نے بعض ایسی اشتعال انگیز تقریریں کیں جن کی بنیاد پر حکومت ہند کی خفگی بجا طور پر بڑھ گئی (ص ۳۹۳) پھر اتحاد المسلمین کی قیادت نے کونسلٹ پارٹی سے اتحاد کر کے یہ سمجھا کہ اب سارے ریاستی عوام اس کے ساتھ ہیں یہ ایک ایسی سخت غلطی تھی جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا (ص ۳۹۴)

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں حیدر آباد کی قیادت اور وزارت کی غلطی یہ تھی کہ اس نے ان انقلابی حالات کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جو انگریزوں کے ہندوستان سے جاتے اور ملک میں جمہوری اور پارلیمانی نظام حکومت قائم ہونے سے ظہور میں آئے (ص ۴۰۵) اگر حیدر آباد کی قیادت ذرا دور بینی کا مظاہرہ کرتی تو شاید ہزاروں بے گناہوں کے خون کی ارزانی دیکھنے میں نہ آتی۔

حیدر آباد سے متعلق اس باب کے آخر میں مصنف نے بعض ان دانشوروں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اُن کو قیام حیدر آباد کے دوران ملنے کا موقع ملا۔ ان میں مشہور مترجم قرآن پکتال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، خواجہ غلام السیدین، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، مرزا اصغر گوٹڈوی اور قاضی عبدالغفار قابل ذکر ہیں۔ بالخصوص حسرت جگر اور فانی جیسے ادیبوں و شاعروں کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔

آسمان اور آخری باب علی گڑھ سے متعلق ہے جہاں مصنف نے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک بطور پروفیسر وائس چانسلر کام کیا۔ اس باب میں آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات، مسائل کا گہرا اور فاضلانہ تجربہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے معاملات کی برقیاتی کمیٹی بنی تھی اس کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں طلبہ نے جو نامناسب اور شرمناک پروٹا بازی کی اور جس طرح تجربہ کار، معزز اور قابل احترام اساتذہ کو زد و کوب کیا اس کی دلخراش داستان بھی موجود ہے۔ خود ڈاکٹر یوسف حسین خان اور پروفیسر خلیق احمد نظامی شدید زخمی ہوئے مسلم یونیورسٹی کے اس سات سالہ قیام کے دوران مصنف کو عبادت میں آزادی کے بعد اسلامی تعلیم و ثقافت کی بقا اور مستقبل پر بھی غور کرنے کا یقیناً موقع ملا ہوگا، انہوں نے ان موضوعات سے متعلق کئی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے۔

یہ ہے اس کتاب کے مباحث کی ایک سرسری سی جھلک۔ پوری کتاب اسی قدر دلچسپ اور معلومات افزا ہے کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ قاری ختم کئے بغیر اس کو چھوڑے۔ مصنف جا بجا گھر سے پھرے ہیں، ملک اور شہر شہر کے تجربات و مشاہدات سامنے آتے ہیں اہل علم و ادب کا تذکرہ ہے، مصنف کو برصغیر کے بڑے بڑے ادیبان سیاست کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان کے بارے میں تاثرات ملتے ہیں۔ سیاسی تحریکات کے بارے میں بطور ایک عالم اور ادیب ان کا رد عمل کیا ہوا یہ بھی پتہ چلتا ہے جا بجا حب الوطنی کے اعلیٰ جذبات چھلکتے ہیں۔ ہر واقعہ اور مشاہدہ سے سبق لینے کا جو ملکہ اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں، پھر ان کی بے پایاں علمی تلاش کا جذبہ ہے جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔ پیرس کی حسین شاہیں مولانا حیدر آباد دکن میں اجنٹا کی تصویریں وہ ہر موقع پر علمی نتائج

اغذ کرنے سے نہیں چوکتے۔ ایک اور دلچسپ چیز مصنف کے طبی تجربات ہیں جو باجبا نظر آتے ہیں (مثلاً ۶۶، ۶۷، ۱۵۰) غرض پوری کتاب نظیری کا یہ مشہور مصرعہ گنگائی محسوس ہوتی ہے کہ شہ دامن دل فی کشد کہ با ابخاست۔

پھر زبان کی شستگی، محاوروں اور انداز بیان کی بندش اور چستی تو ایسی چیزیں ہیں جو روح آہل اور اردو غزل کے مصنف کے ہاں جتنی بھی ہوں ان کا حق ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ غرور و تعلیٰ سے پاک صاف انداز تحریر تاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتا۔ پوری کتاب میں کہیں کوئی ادعا نہیں، کوئی بڑائی نہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مکھنے والا وہ شخص ہے جس کی ہر کتاب میں اپنے موضوع کی انتہائی کتابوں میں سے ہے۔ نہ صرف کتاب میں بلکہ شاید مصنف اپنی عام زندگی میں بھی تواضع کے اس قدر معیار پر عمل پیرا ہیں (ص ۲۹، ۲۳۱)

پوری کتاب میں کہیں بھی کوئی اختلافی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ کسی سیاسی، یا نظریاتی مخالف کے خلاف کچھ نہیں لکھا گیا۔ مصنف ایک ایسے مفکر اور سیاسی لیڈر کے بھائی ہیں جن کے سیاسی اور تعلیمی نظریات سے بہتوں کو اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن انہوں نے اول تو ان معاملات کو چھیڑا نہیں، اگر کہیں کوئی اشارہ کیا بھی ہے تو نہایت عمدہ پیرائے بیان میں جس سے کسی کی کوئی دل آزاری نہیں ہوتی۔

لیکن افسوس ہے کہ ان خوبیوں کی حامل یہ کتاب طباعت کے اس معیار پر چھپی ہے جس سے کم کسی معیار کا شاید بیسی صدی کے ربع آخر میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہے اس کی وجہ ناشرین کی زبردست مالی مجبوریوں۔ لیکن یہ کتاب اس کی مستحق تھی کہ اس کو طباعت کے اعلیٰ ترین معیار پر چھایا جاتا۔ افسوس ہے کہ ایسے ادارے جن کا کام محض نئی پراگندگی پیدا کرنا رہ گیا ہے ان کو رسائی کی فراوانی حاصل ہے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسا تاسخ ساز ادارہ شاید اس لئے مالی مشکلات کا شکار ہے کہ ہندوستانی اسلامی علوم اسلامی تہذیب، اردو زبان اور اردو ادب کی مقدور بھرپور خدمت کر رہا ہے۔